13085CH14

باب 14

جدیدیت کا دور

اردو میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد شعروادب کے میدان میں ایک نئے رجحان کی ابتدا ہوئی۔ اسے جدیدیت کے رجحان سے موسوم کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس نے اس قدر وسعت پائی کہ لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ بن گیا۔ یہ رجحان مغرب میں اس وقت شروع ہوا جب انیسویں صدی کے اواخر میں صنعتی انقلاب کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے تھے اور بعد میں اس کے منفی نتائج سامنے آئے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے نظامِ زندگی کو درہم برہم کر دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر تخلیق کار خارج کے بجائے اپنی ذات کے اندرون کی دنیاؤں میں پناہ لینے لگے۔

اردو میں جدیدیت کے رجحان کا آغاز 1950 کے آس پاس ہوا۔ اس رجحان سے وابستہ ادیبوں نے ان باتوں پر خاص طور سے زور دیا کہ تخلیقی فن کار تخلیق کے عمل میں آزاد ہوتے ہیں اس لیے ہم ان سے یہ تقاضا نہیں کر سکتے کہ وہ لازماً اپنے ادب سے سماجی اصلاح کا کام لیں۔ جدیدیت کے رجحان کے تحت اس بات پر بھی اصرار کیا گیا کہ فنی اصولوں اور تقاضوں کو مُقدّم رکھنا ادیب و شاعر کا پہلا فرض ہے۔ چنانچہ جدیدیت سے وابستہ ادیبوں نے شعروادب کی تخلیق میں زبان و بیان کی سطح پر نہ صرف استعاراتی اور علامتی طرزِ اظہار کو فروغ دیا بلکہ ادب کی تخلیق کے دوران تازگی اور نیا پن پیدا کرنے کی غرض سے مختلف النوع تجربات بھی کیے۔ اس طرح ادب میں تجربہ پسندی کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

جدیدیت سے وابستہ ادیبوں نے نظریاتی وابستگی سے خود کو الگ رکھا اور صرف ادبی اصول اور معیاروں کو ترجیح دی۔ انھوں نے نئے زمانے کے عام فکری رجحان کے زیرِ اثر انسان کے انفرادی تجربات اور داخلی دنیا کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اس طرح جدیدیت میں خارجی دنیا کی سچائیوں سے زیادہ انسان کی باطنی دنیا کے پیچیدہ تجربوں کو بیان کرنے کو اوّلیت دی جانے لگی۔ یہ صورت حال عام طور سے جدیدیت کے فروغ کے زمانے میں اردو شاعری اور فکشن دونوں میں نظر آتی ہے۔

© NCERT not to be republished

نمائندہ شعرا

ناصرؔ کاظمی (1925-1972/74) : ان کا نام ناصر رضا کاظمی تھا۔ وہ انبالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ناصرؔ کاظمی جدید غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اُن کی غزلیں اپنے دھیمے لہجے، دبے دبے دَرد اور جدید طرزِ احساس کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ انھوں نے اکثر ایسے الفاظ استعمال کیے جو غزلیہ شاعری میں عام نہیں تھے۔ ناصرؔ کاظمی کے کلام میں بے حد تازگی ہے۔ ان کی غزلیں ان کے عہد کی عام اداسی کی ترجمان ہیں۔

ان کے مجموعۂ کلام 'برگِ نے'، 'دیوان' اور 'پہلی بارش' ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ 'نشاطِ خواب' ہے۔ ان کی دو نثری کتابیں بھی ہیں، ایک 'ناصر کاظمی کی ڈائری' اور دوسرا ان کے مضامین کا مجموعہ 'خشک چشمے کے کنارے'۔ وہ 'اوراقِ نو' اور 'ہمایوں' کے مدیر بھی رہے۔

ترے خیال سے لَو دے اُٹھی ہے تنہائی　　　شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

کچھ یادگارِ شہر ستم گر ہی لے چلیں　　　آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر　　　اداسی بال کھولے سو رہی ہے

زیب غوری (1926-1985): ان کا نام خان احمد حسین خان غوری تھا۔ زیب غوری کا شمار جدیدیت کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ کانپور (یو پی) کے رہنے والے تھے۔ بنیادی طور پر غزل گو ہیں۔ ان کے کلام میں فکر و احساس کی تازگی کے علاوہ زبان و بیان کی سطح پر بھی نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ 'زرد زرخیز' اور 'چاک' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

میں عکسِ آرزو تھا ہوا لے گئی مجھے　　　زندانِ آب و گل سے چھڑا لے گئی مجھے

نہ کسی سے کوئی مطلب نہ تقاضا اپنا　　　شاخ پر کھلنا، فضاؤں میں مہکنا اپنا

ایسا لگا ہے جیسے خموشی میں شام کی　　　میں ہی کھڑا ہوا ہوں سمندر کے پار بھی

خلیل الرحمٰن اعظمی (1927-1978) : خلیل الرحمٰن اعظمی سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کی ڈِگریاں حاصل کیں۔ پھر وہیں شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ طویل بیماری کے بعد علی گڑھ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

© NCERT not to be republished

خلیل الرحمٰن اعظمی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی نثری تصانیف میں 'اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'، 'مضامینِ نو' اور 'فکر و فن' شامل ہیں۔ 'نوائے ظفر'، 'مقدمہ کلامِ آتش' اور 'نئی نظم کا سفر' مع مقدمہ ان کی مرتّب کی ہوئی کتابیں ہیں۔

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے	مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے
گھر میں بیٹھے سوچا کرتے، ہم سے بڑھ کر کون دکھی ہے	اک دن گھر کی چھت پر چڑھے تو دیکھا گھر گھر آگ لگی ہے
نشۂ مئے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں	کچھ بہانے مرے جینے کے لیے اور بھی ہیں

قاضی سلیم (1927-2005): قاضی سلیم کی پیدائش اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں ہوئی۔ وہ اصلاً نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں پیچیدہ اور گہرے تجربوں کو زیادہ تر بالواسطہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ قاضی سلیم کا شمار جدیدیت کے نمائندہ نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔

باقر مہدی (1927-2007): باقر مہدی لکھنؤ کے قریب ایک قصبے ردولی کے رہنے والے تھے۔ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی میں حاصل کی۔ زندگی کا بڑا حصہ ممبئی میں گزارا۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ سیاہ سیاہ (کلیات شاعری) آگہی و بے باکی' اور 'تنقیدی کشمکش' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ باقر مہدی کا شمار جدیدیت سے وابستہ ان شعرا میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری میں نئے نئے تجربوں کو زیادہ راہ دی۔ باقر مہدی نے نظمیں اور غزلیں دونوں میں طبع آزمائی کی۔ زندگی کا بڑا حصہ ممبئی میں گزارا۔

آندھی کو اپنی شاخ میں روکے کھڑے رہے	یوں احتجاج کچھ نئے اشجار کر گئے
اگر یہ آس تڑپتی نہ میری رگ رگ میں	خلش کا نام کوئی انتظار کیوں رکھتا

محمد علوی (1927-2018): محمد علوی کا تعلق گجرات کے شہر احمد آباد سے ہے۔ جدیدیت سے وابستہ جن شاعروں کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں محمد علوی کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ 'خالی مکان'، 'آخری دن کی تلاش'، 'تیسری کتاب' ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ ان کا کلیات 'رات ادھر ادھر روشن' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

زمین لوگوں سے ڈر گئی ہے	سمندروں میں اُتر گئی ہے
اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا	یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا
گھروں میں اداسی ہے، رستوں پہ دھول	درختوں کی شاخوں پہ پتے نہ پھول

© NCERT not to be republished

عمیق حنفی (1928/29-1985/88): ان کا نام عبدالعزیز تھا۔ وہ مہو چھاؤنی، ضلع اندور کے رہنے والے تھے۔انھوں نے تعلیم اندور میں حاصل کی۔تاریخ اور فلسفہ سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔اصلاً نظم نگار ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں کو انسانی وجود کے کرب کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ انھوں نے کچھ طویل نظمیں بھی لکھیں جو بہت مشہور ہوئیں۔ اردو میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'سنگ پیراہن' کے نام سے شائع ہوا۔انھیں شہرت اپنی طویل نظم 'سندباد' کی اشاعت سے ملی۔دوسری طویل نظموں میں 'شب گشت'، 'سیارگاں'، 'کیوپڈیا'، 'شہرزاد' وغیرہ ہیں۔'صلصلۃ الجرس' ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔ 'شعلے کی شناخت' اور 'شعر چیزے دیگر است' ان کی تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

جاتا نہیں کناروں سے آگے کسی کا دھیان
کب سے پکارتا ہوں یہاں ہوں یہاں ہوں میں
پھول کھلے ہیں، لکھا ہوا ہے توڑو مت
اور مچل کر جی کہتا ہے چھوڑو مت
بہار پھول کھلاتی پھرے چمن میں تو کیا
کسی کے بندِ قبا ٹوٹنے لگیں تب ہے

مظہر امام (1928-2012) : مظہر امام کی پیدائش مونگیر، بہار میں ہوئی۔ انھوں نے مگدھ یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم۔اے کی ڈگریاں لیں۔ مظہر امام نے غزل کے میدان میں نئے نئے تجربات کیے۔ انھوں نے آزاد غزل کا تجربہ کیا۔نثر میں بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔'زخم تمنّا'، 'رشتہ گونگے سفر کا'، 'پچھلے موسم کا پھول' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ان کے مضامین اور خاکوں کا مجموعہ بھی کتابی صورت میں شائع ہوا۔انھیں 'ساہتیہ اکادمی' اور مختلف اردو اکادمیوں نے انعامات سے سرفراز کیا۔

عہدِ نو مجھ کو نگاہوں میں بسا لو کہ میں
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں
دوستوں سے ملاقات کی شام ہے
یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا

بلراج کومل (1928-2013): بلراج کومل کی پیدائش سیالکوٹ (پاکستان) میں ہوئی۔ جدیدیت کے نمائندہ شعرا میں بلراج کومل کا نام بہت نمایاں ہے۔انھوں نے زیادہ تر نظموں ہی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ان کی نظمیں گہرے انسانی تجربے کی عکاسی کرتی ہیں۔انھوں نے افسانے اور تنقید بھی لکھی ہے۔ شعری مجموعوں میں 'میری نظمیں'، 'سفر مدام سفر'، 'پرندوں بھرا آسمان' معروف ہیں۔ ادب کی تلاش ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ (1930-2012) : شفیق فاطمہ شعریٰ کی پیدائش ناگپور میں ہوئی۔ انھوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بی۔اے۔ کا امتحان عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد اور ایم۔اے کا امتحان ناگپور یونیورسٹی سے پاس کیا۔شعریٰ ممتاز کالج حیدرآباد میں اردو کی درس و تدریس سے وابستہ رہیں اور یہیں سے سبکدوش ہوئیں۔

© NCERT not to be republished

شعریٰ بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ ان کے کلام میں پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ اکثر نظموں میں شِعریٰ نے اسلامی تاریخ اور قرآنی واقعات سے بھی مدد لی ہے۔ انھوں نے موجودہ زمانے کے تہذیبی اور سیاسی مسائل کو جس انداز سے نظموں کا موضوع بنایا ہے، اس سے بھی ان کا منفرد اسلوب نمایاں ہوتا ہے۔ 'یادنگر' ان کی مشہور نظم ہے۔ 'آفاقِ نوا' اور 'گلّہٴ صفورہ' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'سلسلہٴ مکالمات' ان کا کلیات ہے۔

باؔنی (1932-1981) : ان کا نام راجندر منچندہ تھا۔ وہ ملتان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم انھوں نے آزادی سے پہلے ملتان ہی میں حاصل کی۔ تقسیمِ وطن کے بعد دہلی منتقل ہوگئے اور یہیں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ دہلی ہی میں انتقال ہوا۔

باؔنی کا تعلق اردو شاعروں کی اُس نسل سے ہے، جس نے ناؔصر کاظمی کے بعد غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ ان کی زبان اور بیان میں بہت تازگی ہے۔ بعد کے کئی شعرا پر باؔنی کا گہرا اثر ہے۔

زماں مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے — میں ڈھیر ہوگیا طولِ سفر سے ڈرتے ہوئے
بس ایک زخم تھا دل میں جگہ بناتا ہوا — ہزار غم تھے مگر بھولتے بِسرتے ہوئے
اے صفِ ابرِ رواں، تیرے بعد — ایک گھنا سایہ شجر سے نکلا

احمد مشتاق (پ-1933): احمد مشتاق امرتسر میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں بسر کیا۔ پھر امریکہ میں مقیم ہوگئے۔ جدیدیت کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے صرف غزل کو وسیلہٴ اظہار بنایا ہے۔ احمد مشتاق کی غزلوں کی بنیادی صفت کلاسیکی اور جدید طرز کا امتزاج ہے۔ ان کی غزلوں میں نئے انسان کی حسّیت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی سطح پر خوشگوار تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے دو مجموعے 'مجموعہ' اور 'گردِ مہتاب' کے علاوہ کلیات بھی شائع ہوچکا ہے۔

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے — ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں
اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے — اور اب کوئی کہیں، کوئی کہیں رہتا ہے
غیر دلچسپ تھا یقین کا کھیل — سب کرشمے گمان کے دیکھے

ظفر اقبال (پ-1933): ظفر اقبال اوکاڑا، مغربی پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ لیکن انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کرلی۔ غزل کے میدان میں ظفر اقبال نے جدیدیت کے رجحان کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ وہ پُرگو اور قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ 'آبِ رواں'، 'گلافتاب' اور 'رطب و یابس' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح — اور اس دشت میں رہ جائے گی جھنکار مری
پوچھ آؤ کہ میں ویسا ہی کھڑا سوکھتا ہوں — دیر کتنی ہے مجھے برگ و نوا دینے میں

© NCERT not to be republished

کمار پاشی (1935-1992) : ان کا نام شنکر دت کمار تھا۔ ان کی پیدائش بہاولپور میں ہوئی۔ تقسیم کے بعد دہلی منتقل ہو گئے۔ یہیں ملازمت کی اور یہیں انتقال ہوا۔ اپنی وضع کے بہت منفرد شاعر تھے۔ غزل اور نظم دونوں اصناف پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ ان کے شعری مجموعوں 'پرانے موسموں کی آواز' اور 'خواب تماشا' کو غیر معمولی شہرت ملی۔ 'ولاس یاترا' ان کی طویل نظم ہے۔

کمار پاشی نے ڈرامے، افسانے اور مضامین بھی لکھے ہیں 'سطور' کے نام سے انھوں نے ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔

آیا بسنت پھول بھی شعلوں میں ڈھل گئے
میں نے انھیں چھوا تو مرے ہونٹ جل گئے

نہ پوچھ مجھ سے میرا قصّۂ زوالِ جنوں
میں پانیوں پہ برستا رہا گھٹا کی طرح

شمس الرحمٰن فاروقی (1935-2020): شمس الرحمٰن فاروقی کا اصل وطن اعظم گڑھ ہے لیکن ان کی پیدائش پرتاپ گڑھ (یوپی) میں ہوئی۔ ان کا شمار جدیدیت سے تعلق رکھنے والے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل اور نظم کے علاوہ رباعی کے میدان میں بھی اپنی انفرادیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کے کلام کی بنیادی صفت پیچیدہ تخلیقی تجربے کے ساتھ ساتھ استعاراتی اور علامتی طرز بیان ہے۔ ان کے اب تک چار مجموعۂ کلام 'گنج سوختہ'، 'سبز اندر سبز'، 'چہار سمت کا دریا' (رباعی) اور 'آسماں محراب' شائع ہو چکے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے اشعار:

عدم میں کچھ نہ خبر تھی کہ کون ہوں کیا ہوں
کھلی جو آنکھ تو پہلی نظر اُسی سے ملی

تو جا کر رہ گیا کس کی گلی میں اے دل اے دل
مجھے چھوڑا ہے کس کی دوستی میں اے دل اے دل

شہر شگوفہ شرار سے روشن، گلیاں خون کی پیاسی ہیں
اک میں اپنی شہ رگ سے کس کس کی آگ بجھاؤں گا

عادل منصوری (1936-2008): عادل منصوری احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے گجراتی اور اردو دونوں زبانوں کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ جدیدیت کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والے شعرا میں عادل منصوری کو مہم جو اور تازہ کار شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ وہ ایک تجربہ پسند شاعر تھے۔ غزلوں اور نظموں دونوں میں انھوں نے ہمیشہ نئے مضامین پر توجہ دی ہے۔ ان کے کلام میں پیچیدگی اور اِبہام کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ ان کا کلیات 'حشر کی صبح درخشاں' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ وہ طویل عرصے تک امریکہ میں مقیم رہے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

دیکھا تھا سب نے ڈوبنے والے کو دور دور
پانی کی انگلیوں نے کنارے کو چھو لیا

دھول اڑتی ہے منزل جاں میں
راستے میں بکھر گیا ہوں میں

وہ کون تھا جو دن کے اجالے میں کھو گیا
یہ چاند کس کو ڈھونڈنے نکلا ہے شام سے

شہر یار (1936-2012) : ان کا نام کنور اخلاق محمد خاں ہے۔ آنولہ، ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے، پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے اور پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ علی گڈھ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

شہر یار موجودہ دور کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ انھیں غزل اور نظم دونوں اصناف پر قدرت حاصل تھی۔ 'اسمِ اعظم'، 'ساتواں در'، 'ہجر کے موسم'، 'خواب کا در بند ہے' اور 'نیند کی کرچیں' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کا کلّیات 'حاصلِ سیرِ جہاں' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ انھیں بہت سے اعزازات ملے جن میں ادب کا سب سے بڑا اعزاز 'گیان پیٹھ ایوارڈ' بھی شامل ہے۔

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس، کہیں کچھ کم ہے

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

یہ آگ ہوس کی ہے جھلس دے گی اُسے بھی
سورج سے کہو سایۂ دیوار میں آئے

اے شہر ترا نام و نشاں بھی نہیں ہوتا
جو حادثے ہونے تھے اگر ہو گئے ہوتے

مظفر حنفی (1936-2020): ان کا نام محمد ابوالمظفر ہے۔ وہ کھنڈوہ (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں پائی۔ انھوں نے سیفیہ کالج، بھوپال سے اردو میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ کچھ برس سرکاری ملازمت کی۔ پھر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد مقرر ہوئے۔ 1989 میں کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ شاعری کی طرف وہ بچپن ہی سے مائل تھے۔ بعدازاں شاد عارفی کے شاگرد ہوئے۔ مظفر حنفی کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ متعدد شعری مجموعوں کے علاوہ کئی افسانوی اور تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزل ان کا خاص میدان ہے۔ بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ گہری اور گمبھیر باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں طنز ایک حاوی رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔

مشورہ پاگل ہواؤں سے بھی لینا چاہیے
عقل مندو! ریت کی دیوار یوں اُٹھتی نہیں

دروازے پہ تحریر، یہاں کوئی نہیں ہے
اندر کوئی زنجیر ہلاتا ہے کہ میں ہوں

آ مرے سینے سے لگ جا تو اگر سیلاب ہے
اور خوشبو ہے تو جا بستی میں گھر گھر پھیل جا

زبیر رضوی (1936-2016) : زبیر رضوی امروہہ کے ایک ممتاز دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے حیدر آباد میں حاصل کی۔ بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات دہلی یونیورسٹی سے پاس کیے۔ 1993 میں آل

© NCERT not to be republished

انڈیا ریڈیو سے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ جن جدید شعرا نے نئی نسلوں کے لیے فضا سازی کی تھی اُن میں زبیر رضوی کا خاص مقام ہے۔ ان کے رسالے 'ذہن جدید' نے ذہن سازی اور رجحان سازی کا کام کیا ہے۔

زبیر اپنی طرز کے منفرد شاعر ہیں۔ نظم ہی نہیں غزل میں بھی ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ 'لہر لہر ندیا گہری'، 'خشتِ دیوار'، 'انگلیاں فگار اپنی'، 'دھوپ کا سائبان'، 'دامن اور پرانی بات ہے' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

وہ ایک طفل جو مجھ میں تھا ہو گیا بوڑھا — جو منتظر تھیں مری وہ شرارتیں بھی گئیں
وہیں پہ برسا ہے بادل جہاں ہوا نے کہا — ہمارے صحن میں بارش برائے نام آئی
وہ جس کو دیکھنے کو بھیڑ اُمڈی تھی سرِ مقتل — اسی کی دید کو ہم بھی ستونِ دار تک آئے

پروین شاکر (1952-1994) : اُن کی پیدائش کراچی میں ہوئی۔ انھوں نے انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد لسانیات اور بینک ایڈمنسٹریشن میں بھی ایم۔اے کیا۔ نو سال تک تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد پاکستان سول سروس جوائن کر کے کسٹم ڈپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہیں۔ کراچی میں ایک سڑک حادثے میں ان کی وفات ہوئی۔

'خوشبو'، 'صد برگ'، 'خود کلامی' اور 'انکار' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'ماہِ تمام' کے نام سے اُن کا کلّیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ 1990 میں انھیں پاکستان کے اعلیٰ ترین اعزاز 'نشانِ امتیاز' سے نوازا گیا۔ پروین شاکر کی شاعری نسائی احساسات، کیفیات اور جذبات کی عکّاسی کرتی ہے۔

میں سچ کہوں گی مگر، پھر بھی ہار جاؤں گی — وہ جھوٹ بولے گا، اور لاجواب کر دے گا
کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی — اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے — موجِ صبا کے ہاتھ میں اس کا سراغ ہے

اس دور کے دیگر اہم شعرا میں، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، مخمور سعیدی، رفعت سروش، بشر نواز، شاذ تمکنت، نذیر بنارسی، کلیم عاجز، محبوب راہی، ظفر کمالی، مدحت الاختر اور شجاع خاور وغیرہ شامل ہیں۔

نمائندہ فکشن نگار

اقبال متین (1924-2015) : ان کا نام سید مسیح الدین خاں ہے۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم چِنتا پور میں ہوئی۔ چادر گھاٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد حیدرآباد کے جاگیر ایڈمنسٹریشن آفس میں انھوں نے ملازمت کر لی۔

اقبال متین کو افسانوی فضا سازی کے فن میں کمال حاصل ہے۔ کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کو وہ جس

طرح پیش کرتے ہیں اس میں نکتہ رسی پائی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب میں افسانویت اور شعریت کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ ’چراغ تہہِ داماں‘ ان کا ناول ہے۔ ’نُچا ہوا البم‘، ’خالی پٹاریوں کا مداری‘، ’آ گہی کے ویرانے‘ اور ’شہر آشوب‘ ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

جوگندر پال (1925-2016) : جوگندر پال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1941 میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور مرے کالج سے انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کی تعلیم حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی، چندی گڑھ سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ کینیا چلے گئے اور نیروبی میں پہلے ٹیچر بعد میں ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی عہدے سے رضا کارانہ ریٹائرمنٹ لے لیا۔ 1964 میں وہ ہندوستان واپس آ گئے اور اورنگ آباد کے ایس۔ بی۔ کالج سے بہ طور انگریزی استاد وابستہ ہو گئے۔ 1976 سے دہلی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

جوگندر پال کا شمار آزادی کے بعد کے ممتاز فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اسلوب اور تکنیک کی سطح پر کئی تجربے کیے اور اردو افسانے کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ انھوں نے استعاروں اور علامتوں کے استعمال سے اپنے افسانے کی معنوی جہات میں تنوّع اور وسعت پیدا کی ہے۔ جوگندر پال نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی دیومالا اور اساطیر سے بھی کام لیا ہے۔

’میں کیوں سوچوں‘، ’رسائی‘، ’مٹی کے ادراک‘، ’لیکن‘، ’بےمحاورہ‘، ’بے ارادہ‘، ’کھلا‘، ’’کھودو بابا کا مقبرہ‘ ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ ’سلوٹیں‘ اور ’کتھا نگر‘ ان کے افسانچوں کے مجموعے ہیں۔ ’نادید‘، ’پار پرے‘ اور ’خواب رو‘ ان کے اہم ناول ہیں۔

غیاث احمد گدّی (1928-1986) : غیاث احمد گدّی جھریا ضلع دھنباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے افسانے عوامی زندگی سے قریب ہیں۔ وہ بنیادی طور پر علامتی اور تجریدی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ایک مخصوص علاقائی تہذیب کے ترجمان ہیں۔ ’پرندہ پکڑنے والی گاڑی‘ ان کا مشہور افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ ’دیمک‘، ’جوہی کا پودا اور چاند‘، ’پیاسی چڑیا‘، ’اندھے پرندے کا سفر‘، ’نارمنی‘، ’ڈوب جانے والا سورج‘ وغیرہ افسانے بھی کافی مقبول ہوئے۔ ’بابا لوگ‘ اور ’پرندہ پکڑنے والی گاڑی‘ ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ’پڑاؤ‘ ان کا اہم ناول ہے۔

سریندر پرکاش (1930-2001/02): ان کا نام سریندر پرکاش اوبیرائے تھا۔ وہ لائل پور موجودہ فیصل آباد، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں انھوں نے ہفتہ وار ’پارس‘ جاری کیا۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ممبئی کی ایک فلم کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں لکھنا شروع کیا لیکن اس تحریک سے الگ اپنی راہ نکالی اور تجریدی طرزِ اظہار کو اپنایا۔

© NCERT not to be republished

ان کے افسانے 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' سمندر، میدان، پگ ڈنڈیاں، آتش دان، دیواریں اور ان پر لگی تصویریں، اپنے علامتی کردار کے باعث خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ سریندر پرکاش کے افسانوں میں اسطور سازی کا عمل بھی ملتا ہے۔ 'بجوکا' ان کا مشہور افسانہ ہے۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ بجوکا کے عنوان سے اردو کے علاوہ بعد میں بعض دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی کئی افسانے لکھے گئے۔ 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'، 'برف پر مکالمہ'، 'باز گوئی'، 'حاضر حال جاری' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ 'فساں' نام سے ان کا ایک ادھورا ناول بھی ماہنامہ شاعر میں شائع ہوتا رہا ہے۔

اقبال مجید (1934-2019): اقبال مجید ضلع سیتا پور، اُتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ کچھ عرصے تک اسکول میں پڑھاتے رہے اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے وابستہ ہوگئے۔ جہاں وہ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

اقبال مجید، عہدِ جدید کے نامور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں آج کے انسان کی داخلی اور نفسیاتی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔ افسانوی تکنیک میں بھی انھوں نے بعض اہم تجربے کیے ہیں۔ اقبال مجید نے کئی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ 'نمک' اور 'کسی دن' ان کے دو ناول ہیں۔ 'دو بھیگے ہوئے لوگ'، 'ایک حلفیہ بیان'، 'شہرِ بدنصیب'، 'تماشا گھر' اور 'آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

بلراج مینرا (1934 - 2016) : بلراج مینرا ہوشیار پور پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ہوشیار پور میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد آگے کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

1960 کے بعد کی نسل کے افسانہ نگاروں میں بلراج مینرا منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بہت کم افسانے لکھے لیکن اپنی منفرد شناخت کے سبب شہرت حاصل کی۔ ان کے یہاں اسلوب کی تازگی اور احساس کا نیا پن پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں علامتی اور تجریدی افسانے کو پروان چڑھایا۔ بلراج مینرا کا افسانوی مجموعہ 'سرخ و سیاہ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

شفیع جاوید (پ-1935) : شفیع جاوید مظفّر پور، بہار میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے سماجیات میں ایم۔اے کیا۔ وہ محکمۂ اطلاعات ونشریات، حکومتِ بہار کے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

شفیع جاوید کے افسانوں میں ماضی کی یادیں، عصرِ حاضر کے ساتھ گھل مل کر ایک فلسفیانہ رنگ پیدا کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں رمزیت اور اشاریت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ 'دائرے سے باہر'، 'کھلی جو آنکھ'،

© NCERT not to be republished

’تعریف اُس خدا کی‘، اور ’وہ اور میں‘ ان کے مشہور افسانے ہیں۔ ’تیز ہوا کا شور‘، ’کہاں ہے ارضِ وفا‘ اور ’حکایتِ ناتمام‘ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

نمائندہ تنقید نگار

وزیر آغا (1922-2010) : وزیر آغا کی پیدائش وزیر کوٹ ضلع سرگودھا میں ہوئی۔ ہائی اسکول اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کرنے کے بعد انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ’اردو ادب میں طنز و مزاح‘ کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی۔ وزیر آغا بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ تقریباً چالیس برس تک اپنے رسالے سہ ماہی ’اوراق‘ (لاہور) کی انھوں نے ادارت کی۔ اردو میں ایک صنف کے طور پر انشائیہ کو قائم کرنے والوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ ایک مشہور تنقید نگار بھی ہیں۔ وزیر آغا نے نئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی اور نئے ادب کی بنیادوں کو استحکام بخشا۔

وزیر آغا کا مطالعہ وسیع ہے۔ ان کی فکر میں توازن ہے۔ ان کی تنقید کے عمل میں عموماً تحسین کا پہلو حاوی ہوتا ہے۔ جدیدیت سے ذہنی مناسبت کے باوجود ہر ادبی نظریے سے انھوں نے کچھ نہ کچھ اخذ ضرور کیا ہے۔ کہیں کہیں نفسیاتی بصیرت کو بھی کام میں لائے ہیں۔ اکثر تفہیم کے عمل میں لفظ و معنی کو مرکزی حیثیت دینے کے باوجود تاریخ، تہذیب، شخصی اور خاندانی پس منظر کو انھوں نے خاص اہمیت کے ساتھ جگہ دی ہے۔ عمر کے آخری برسوں میں مابعدِ جدید کے تصورات سے بھی وہ متاثر ہوئے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف ادبی نظریات اور مختلف علوم نے ان کے جس تنقیدی تصور کی تشکیل کی ہے اس کا نام ’امتزاجی تنقید‘ ہے۔ ’امتزاجی تنقید‘ کی اصطلاح انھیں کی وضع کردہ ہے۔

ان کا اندازِ بیان شگفتہ اور مدلل ہے۔ ’اردو ادب میں طنز و مزاح‘، ’نظمِ جدید کی کروٹیں‘، ’اردو شاعری کا مزاج‘، ’تصوراتِ عقل و خرد‘ اور ’اقبال اور تصوراتِ عشق‘ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

وارث علوی (1928/36-2014): وارث علوی ایک جدید نقاد ہیں۔ کسی نظریے کو رہ نما بنانے کے بجائے ان کی کوشش یہ جاننے کی ہوتی ہے کہ تخلیق کا اپنا تقاضا کیا ہے؟ وہ خود کیا کہہ رہی ہے؟ یعنی اس کی ہیئت، اس کی تکنیک، اُس کے کردار اور اُس کے سماجی اور تہذیبی تناظر کی نوعیت کیا ہے؟ وارث علوی کے نزدیک محض ہیئت پسندی یا محض لفظ و معنی کے مباحث یا فلسفیانہ قسم کی تفہیم و تعبیر سے تنقید کے وسیع تر تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر نہ تو جدیدیت کے ہیئتی رجحان میں انھیں کوئی کشش نظر آتی ہے اور نہ ترقی پسند ادبی نظریہ اُن کی نگاہ میں سارے مسائل کی کلید ہے۔ وارث علوی کی خاص توجہ فکشن کی طرف رہی۔ منٹو اور بیدی اُن کے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔

© NCERT not to be republished

وارث علوی کے نزدیک محض تحسین سے تنقید کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ وہ زیرِ بحث تخلیقات کی خامیوں اور کم زوریوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں۔ وہ طنز کو حربے کے طور پر استعمال کر کے اپنی تنقید کو تیکھا اور پڑھنے والے کے لیے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ 'ادب کا غیر اہم آدمی'، 'لکھتے رقعہ'، 'لکھے گئے دفتر'، 'بت خانۂ چین' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

گوپی چند نارنگ (پ-1931): گوپی چند نارنگ کی پیدائش دُکّی (بلوچستان) میں ہوئی۔ تقسیمِ وطن کے زمانے میں ہندوستان آ گئے۔ دہلی یونیورسٹی سے انھوں نے اردو میں ایم۔اے۔ اور پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگریاں حاصل کیں اور شعبۂ اردو میں لکچرر ہو گئے۔ کچھ عرصے تک جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے پروفیسر رہنے کے بعد دوبارہ دہلی یونیورسٹی آ گئے اور یہیں سے سبک دوش ہوئے۔ وہ ساہتیہ اکادمی کے صدر بھی رہے۔ وہ ماہرِ لسانیات کے علاوہ ایک بلند پایہ نقاد ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' میں نئی تھیوری کو بنیاد بنایا ہے۔ اسی بنا پر انھیں اردو میں مابعد جدیدیت کا بنیاد گزار بھی کہا جاتا ہے۔ تہذیبی مطالعے کی حیثیت سے 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب' ان کا ایک اہم تنقیدی و تحقیقی کام ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تالیفی، تحقیقی اور تنقیدی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جو ان کے اس مسلسل ادبی سفر پر گواہ ہیں جس میں ٹھہراؤ اور ماندگی کا وقفہ کہیں مانع نہیں آیا ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اپنی تنقید میں لفظ، معنی اور ہیئت کو ترجیح دی ہے۔ تاہم تاریخ، تہذیب، سماج اور فلسفہ و فکر سے بھی کام لیا ہے۔ ان کا ایک خاص اسلوب ہے جو قاری کی توجہ کو برقرار رکھتا ہے۔ 'ادبی تنقید اور اسلوبیات'، 'فکشن کی شعریات'، 'کربلا بطورِ شعری استعارہ' وغیرہ ان کی اہم تنقیدی کتابیں ہیں۔ ان کا ایک سفر نامہ 'سفر آشنا' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

حامدی کاشمیری (1932-2018): حامدی کاشمیری کی پیدائش بہوری کدل (سری نگر) میں ہوئی۔ ان کا شمار نقادوں کی اس صف میں ہوتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے چھٹے دہے سے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب نئی نسل جدیدیت کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ جدیدیت کے سلسلے میں حامدی کاشمیری کی تحریروں نے بھی فضا سازی کا کام کیا۔ انھوں نے نظریاتی مسائل پر بھی لکھا اور عملی تنقید بھی کی۔ وہ اپنی تنقید میں فن پارے کے لفظی نظام اور اس کی توانائیوں کے علاوہ ہیئت، ساخت اور تکنیک کو اکثر مسئلے کے طور پر موضوع بناتے ہیں۔ حامدی کاشمیری نے اکتشافی تنقید کے نام سے جس نئے تصور سے متعارف کرایا ہے اس کے رشتے بھی ہیئتی رجحان سے ملتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

شمس الرحمٰن فاروقی (1935-2020) : شمس الرحمٰن فاروقی بہ یک وقت شاعر، نقّاد اور فکشن نگار ہیں۔ ماہنامہ ’شب خون‘ کے مدیر کی حیثیت سے ادبی صحافت میں بھی وہ ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ میر اور غالب کے شارح کے علاوہ انھوں نے مترجم کے طور پر اپنی شناخت بنائی ہے۔

1955 کے بعد جن نقادوں نے اردو تنقید کے کینوس کو وسیع کیا اور مغرب کے تنقیدی نظریات سے متعارف کرایا، ان میں فاروقی کا نام سرِ فہرست ہے۔ فاروقی نے شاعری میں زبان کی اہمیت اور نوعیت، ہیئت و موضوع کی وحدت اور ترسیل و ابلاغ کے مسئلے پر بے حد تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں لفظ و معنی کے رشتے پر خصوصی بحث کی ہے۔

فاروقی نے اپنے نظریات کی تشکیل میں آئی۔ اے۔ رچرڈز کے علاوہ ولیم اِمپسن اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی تحریروں کو بھی بنیاد بنایا ہے لیکن میر و غالب کے اشعار کی تشریح و تعبیر میں انھوں نے مغربی نظریاتِ نقد کے پہلو بہ پہلو کلاسیکی نظامِ فن کو خصوصی اہمیت کے ساتھ مدِّنظر رکھا ہے۔ ’لفظ و معنی‘، ’شعر غیر شعر اور نثر‘، ’عروض آہنگ اور بیان‘، ’افسانے کی حمایت میں‘، ’شعر شور انگیز‘ اور ’تعبیر کی شرح‘ وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ’سوار‘ ان کے افسانوں کا مجموعہ اور ’کئی چاند تھے سرِ آسماں‘ ان کا اہم ناول ہے۔

وہاب اشرفی (1936-2012) : سید عبدالوہاب اشرفی کی پیدائش بی بی پور، بہار میں ہوئی۔ وہاب اشرفی نے جدیدیت کو وقت کے ایک نئے تقاضے سے تعبیر کیا اور نظریاتی مسئلے کو بار بار اپنی بحث کا موضوع بنایا۔ شاعری، افسانوی ادب اور عالمی ادب کی تاریخ ان کی دلچسپی کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کی تنقید کی ایک نمایاں خوبی اس کا معروضی طریقِ کار ہے۔ اسی چیز نے اُن کے عملی مطالعوں کو اعتبار بھی بخشا ہے۔ وہاب اشرفی نے وقتاً فوقتاً نظریاتی مسائل پر جو مضامین لکھے تھے ان کی تعداد عملی مطالعوں سے کم ہے۔ وہ تشریح و ترجمانی کے بجائے تجزیے پر زیادہ زور دیتے ہے۔ ’مابعدِ جدیدیت: مضمرات و ممکنات‘ اور ’عالمی ادب کی تاریخ‘ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

شمیم حنفی (پ-1939) : شمیم حنفی کی پیدائش سلطان پور اتر پردیش میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے انٹر پاس کیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کرنے کے بعد تاریخ اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ وہیں سے اردو میں ڈی۔ فل کی ڈگری لی۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں انھوں نے پروفیسر کے طور پر درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور وہیں سے سبک دوش ہوئے۔ ’جدیدیت کی فلسفیانہ اساس‘ ان کا ڈی لِٹ کا تحقیقی مقالہ ہے جس میں انھوں نے تاریخ وار جدیدیت کے سرچشموں کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی تنقید کے عمل میں فلسفیانہ فکر نمایاں ہے۔ تاریخ اور تہذیب کا عمل ذہنی زندگیوں اور خصوصاً تخلیقی بصیرتوں پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور نظامِ فن

not to be republished © NCERT

میں تبدیلیوں کے محرّ کات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ اس قسم کے سوالوں سے شمیم حنفی بار بار دو چار کراتے ہیں۔ ایک نئی قسم کی روشن خیالی نے ان کی تحریروں کو مزید وقار عطا کیا ہے۔

عتیق اللہ (پ-1942) : عتیق اللہ کی پیدائش اُجّین میں ہوئی۔ انھوں نے وکرم یونیورسٹی، اجین سے انگریزی اور اردو میں ایم۔اے کیا۔ مراٹھ واڑا یونیورسٹی۔ اورنگ آباد سے اردو میں پی ایچ ڈی کی اور وہیں تقریباً پانچ برس اردو درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اور مستقل سکونت دہلی میں اختیار کی۔ عتیق اللہ نقاد کے علاوہ نئے لب و لہجے کے اہم شاعر بھی ہیں۔ 'ایک سوغزلیں' اور 'بین کرتا ہوا شہر' ان کے شعری مجموعے اور 'ترجیحات'، 'تعصّبات'، 'بیانات' اور 'تنقید کا نیا محاورہ' ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔

جن نقادوں نے جدید فنی وفکری رجحانات کو اپنی تنقید کے عمل میں خاص اہمیت کے ساتھ جگہ دی تھی ان میں خلیل الرحمن اعظمی، محمود ہاشمی، باقر مہدی، وحید اختر، مغنی تبسّم، فضیل جعفری، ابوالکلام قاسمی اور قاضی افضال وغیرہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔

© NCERT not to be republished